بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

بھلے آدمی کی نشانی یہ نہیں ہے کہ اُس سے کبھی کوئی گناہ سرزد ہی نہ ہُوا ہو۔ اسی طرح بُرے آدمی کی پہچان بھی یہ نہیں ہے کہ اُس کے ہاتھ سے زندگی بھر کبھی نیکی اور بھلائی کا کام سرانجام نہ پایا ہو۔ یہ عین ممکن ہے کہ بھلے آدمی سے کوئی سنگین گناہ سرزد ہو جائے اور اسی طرح یہ بات بھی غیر ممکنات میں سے نہیں ہے کہ ایک انتہائی بُرا آدمی کبھی کوئی غیر معمولی نیکی اور بھلائی کا کام کر گزرے۔ کسی شخص کے نیک یا بد ہونے کا انحصار ایک آدھ فعل پر نہیں ہوتا بلکہ اُس رجحان اور میلانِ طبع پر ہوتا ہے جس کے مطابق وہ اپنے لیے ایک مخصوص اندازِ زیست اور اسلوبِ حیات متعین کرتا ہے۔ ایک نیک آدمی شعوری طور پر بھلائی کے لیے کوشاں رہتا ہے، عزم و ہمت کے ساتھ بُرائی سے بچنے کی کوشش کرتا ہے اور اگر اُس سے بُرائی کا کوئی کام سرزد ہو جائے تو اس کے دِل میں ندامت کا شدید احساس پیدا ہوتا ہے اور وہ زیادہ عزم اور مضبوط ارادے کے ساتھ بُرائی سے بچنے اور بھلائی اختیار کرنے کی فکر کرتا ہے۔ بخلاف اس کے بُرے آدمی سے اتفاقاً یا ارادۃً کوئی نیکی صادر ہو سکتی ہے مگر اس کا عام رجحان بُرائی ہی کی طرف ہوتا ہے اور یہی چیز اسے بُرا انسان بناتی ہے۔

انسانی زندگی میں اصل اور فیصلہ کُن اہمیت اِکا دُکا کاموں کی نہیں ہوتی بلکہ اُس اندازِ فکر کی ہوتی ہے جو کسی فرد کے افعال و اعمال کا سرچشمہ ہے۔

یہی صورتِ حال ہمیں اقوام کے معاملے میں ملتی ہے۔ کسی قوم کے اساسی تصورات کا اندازہ

اُس کے کسی ایک کام سے نہیں لگایا جا سکتا بلکہ اُس طرزِ فکر سے لگایا جاتا ہے جس کی وہ علمبردار بن کر اپنی خارجی اور داخلی پالیسی کے رُخ متعین کرتی ہے اور جس کے تحت اس کی ساری سرگرمیاں جاری رہتی ہیں۔

امریکہ اور انگلستان سرمایہ دارانہ نظام کے علمبردار ہیں اور اسی نظام کی توسیع و ترقی کے لیے وہ زندہ اور کوشاں ہیں۔ اُن کی سعی و جہد کا مقصود اسی نظامِ سرمایہ داری کو زیادہ سے زیادہ تقویت پہنچانا ہے۔ ان کے ہاں اگر کسی معاملے میں عام انداز سے ہٹ کر کوئی دوسرا انداز اختیار کیا جاتا ہے تو اس کا مقصد بھی بالواسطہ اسی نظام کی خدمت اور چاکری ہوتا ہے۔ یہی حال اشتراکی ممالک کا اپنے نظامِ اشتراکیت کے معاملہ میں ہے۔ وہ بھی ایک خاص نصب العین کے حصول کے لیے سرگرمِ عمل ہیں۔ اُن کی ساری کوششیں اشتراکیت کے مقاصد کو حاصل کرنے میں صرف ہوتی ہیں۔ اپنے عوام کی صلاحیتوں اور اپنے ملکی وسائل کو صرف اسی ایک متعین راہ پر لگا دینے ہی میں وہ اپنی کامیابی اور کامرانی کا راز پاتے ہیں۔ اس ایک راہ سے ہٹ کر وہ بالقصد ایک قدم بھی اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ اور اگر کبھی نادانستہ اُن سے اس قسم کی کوئی حرکت سرزد ہو جائے تو اُن میں سے ہر فرد شدید کرب محسوس کرتا ہے یہاں تک کہ پوری اشتراکی جماعت اس کے ازالے کے لیے فکرمند ہو جاتی ہے۔

نصب العین کا تعین اور اُس کی محبت اور پھر اس کے حصول کے لیے سچی تڑپ اور لگن نہ صرف کسی فرد اور قوم کی صلاحیتوں کو بیدار کرتی اور انہیں مجتمع کر کے ایک خاص راہ پر لگانے کا عزم اور ولولہ پیدا کرتی ہے بلکہ اس کے شعور کو پختگی اور احساس کو گہرائی بھی عطا کرتی ہے۔ کسی فرد یا قوم کو اپنے مقصدِ حیات سے جتنی زیادہ گہری وابستگی ہو گی اتنا ہی زیادہ اُس کے اندر یہ ارادہ پیدا ہو گا کہ وہ اپنی قوتوں اور اپنے وسائل کو زیادہ سے زیادہ اسی ایک مقصد کے حصول میں صرف کرے۔ جس شخص کی منزلِ مقصود متعین ہو اور وہ اس تک پہنچنے کے لیے سچی آرزو اور

امنگ بھی رکھتا ہو وہ آخر جان بوجھ کر اپنے وقت اور اپنی قوت کو آوارہ گھومنے میں کس طرح گنوا سکتا ہے۔ وہ تو قدرتی طور پر اس بات کا فکر مند رہے گا کہ جلد از جلد قدم اٹھا کر منزلِ مقصود تک جا پہنچے۔ اس راہ میں اُس کا ایک قدم بھی غلط اُٹھ جائے تو اُسے سخت اذیت ہوگی۔

ہر حساس اور باشعور فرد اور ہر زندہ اور باغیرت قوم سے اپنے نصب العین کے ساتھ اسی وابستگی کا اظہار ہوا کرتا ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ مقصدِ حیات کے ساتھ سچی محبت اور اس کے حصول کے لیے دوڑ دھوپ اور قربانی ہی کسی فرد یا قوم کی حیات ہے تو یہ زیادہ صحیح ہوگا۔ اس بدیہی حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے جب ہم اپنے ملک کے حالات کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں سخت مایوسی ہوتی ہے۔

پُوری دنیا اس حقیقت سے واقف ہے کہ پاکستان کا محرک کوئی وطنی جذبہ یا معاشی اور اقتصادی مفاد نہ تھا بلکہ اس تحریک کے پیچھے سرزمینِ ہند کی مسلمان قوم صرف اِس احساس کی بنا پر لگ گئی تھی کہ ہم مسلمان ہونے کے تقاضوں کو اس وقت تک کما حقہٗ پُورا نہیں کر سکتے جب تک ہماری اجتماعی زندگی کا نظام دینِ حق کے تابع نہ ہو، اور یہ چیز صرف ایک ایسی آزاد مملکت ہی میں میسّر آسکتی ہے جس کی سیاست، معیشت، معاشرت اور روحانیت کا مبداء اور اساس اسلام ہو۔ مسلمان یہ سمجھتے تھے کہ اسلام چونکہ خود ایک انقلاب انگیز تحریکِ فکر و عمل ہے جو زندگی کے سارے گوشوں پر حاوی ہے اس لیے وہ کسی دوسری تہذیب کی تابع رہ کر پنپ نہیں سکتی۔ یہ آزاد فضا ہی میں پُوری طرح برگ و بار لاتی ہے۔ اس لیے جن علاقوں میں ہماری اکثریت ہے ان میں ہمیں یہ اختیار ملنا چاہیے کہ ہم زندگی کے جس لائحۂ عمل پر ایمان رکھتے ہیں اسے کسی مزاحمت کے بغیر نافذ کر سکیں۔

ملک کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد کسی صاحبِ اختیار کو یہ کہنے کی جرأت نہیں ہوئی کہ یہ خطۂ ارضی اسلام کی تجربہ گاہ بنانے کے بجائے لادینی نظریات کو فروغ دینے کے لیے حاصل کیا گیا تھا۔ جو لوگ بھی آج تک مختلف اوقات میں اقتدار کے تخت پر متمکن ہوئے ہیں ان کے دلوں میں خواہ کچھ

ہی ہو، زبان کی حد تک انہوں نے اس حقیقت کا کھلے بندوں اعتراف کیا ہے کہ پاکستان کے قیام کا مقصد صرف اسلامی نظام کا احیاء ہے۔ یہ حقیقت اتنی بدیہی، اتنی ناقابلِ تردید اور اتنی واضح ہے کہ اسے ملکی دستور میں بھی پوری طرح تسلیم کیا گیا ہے۔ گذشتہ ۱۸ برسوں میں یہاں عجیب و غریب انقلابات آتے رہے ہیں اور مختلف شخصیتیں مختلف عزائم اور نظریات لے کر اُبھرتی رہی ہیں۔ ان میں سے بعض افراد ایسے بھی نظر آتے ہیں جنہوں نے اپنی طاقت اور قوت کے زعم میں پوری قوم کی رائے کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے بالکل مطلق العنان ہو کر جو چاہا کیا۔ لیکن وہ بھی یہ بات کہنے کی جرأت نہ کر سکے کہ پاکستان کو اسلام کا نہیں بلکہ مغربی تہذیب و تمدن کا گہوارہ بننا چاہیے۔

ان حقائق کو دیکھتے ہوئے انسان کے ذہن میں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پاکستان کا عین وجود جس نظریے کا رہینِ منت ہے، جو اس کے دستور اور آئین میں بطور بنیاد شامل ہے۔ جو پاکستانی عوام کے دلوں کی دھڑکن بن کر دھڑک رہا ہے، جس کی تابندہ روایات ملک کی عظیم اکثریت کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہیں، جس کے ذکر سے آج بھی لوگوں کے افسردہ چہروں پر رونق آجاتی ہے، اور جس پر آنچ آتی نظر آئے تو وہ اس کی حفاظت کی خاطر ہر قربانی کے لیے تیار ہو جاتے ہیں، وہ آخر ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی میں کارفرما کیوں نہیں ہوتا۔

اس کا جواب بالکل واضح ہے جو لوگ ہمارے افراد کی تعلیم و تربیت، اور ہماری اجتماعی زندگی کی تشکیل کے براہِ راست ذمہ دار ہیں انہوں نے اس نظریہ کو دل و جان سے قبول نہیں کیا وہ چونکہ اس نظریے کے بارے میں قومی احساسات سے پوری طرح باخبر ہیں اس لیے وہ زبان سے تو اس کی مخالفت کی جرأت نہیں کرتے۔ اور جہاں قوم کے جذبات سے کھیلنا مقصود ہوتا ہے وہاں اسے ایک مفید اور کارگر ہتھیار کے طور پر بڑی بے تکلفی کے ساتھ استعمال بھی کر لیتے ہیں، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے اس نظریہ کی غیر معمولی اہمیت اور افادیت کو دل کی گہرائیوں سے کبھی تسلیم نہیں کیا، ورنہ وہ اس کے متعلق لاپروائی کا وہ رویّہ اختیار نہ کرتے

جس کے واضح مظاہر ہم قدم قدم پر دیکھتے ہیں۔

اِس حقیقت کو جاننے کے لیے کسی گہری سوچ بچار یا غیر معمولی تفکر و تدبر کی ضرورت نہیں بلکہ روزمرّہ کے واقعات اس کی پوری طرح شہادت دیتے ہیں۔ آپ صرف اس ماہ کے چند واقعات پر نظر ڈالیں تو آپ پر حقیقتِ حال پوری طرح منکشف ہو جائے گی۔

کون شخص اس بات سے ناواقف ہے کہ جس طرح چہرہ دل کا آئینہ ہے بالکل اسی طرح کسی قوم کا میزانیہ (بجٹ) اس قوم کے عزائم اور اُس کی امنگوں کا شارح اور ترجمان ہوتا ہے۔ میزانیہ کو دیکھ کر اس بات کا بآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس قوم کے پیشِ نظر کون سے مقاصد ہیں وہ اُسے کس قدر عزیز ہیں، کس انداز پر وہ ان کے حصول کے لیے اپنے وسائل خرچ کرنے کا ارادہ رکھتی ہے اور اس معاملے میں وہ کتنے ایثار سے کام لینے پر آمادہ ہے۔ اب اگر آپ ۶۷-۱۹۶۶ء کے بجٹ کا اسلامی نقطۂ نظر سے جائزہ لیں تو آپ کو سخت مایوسی ہوگی اور آپ محسوس کریں گے کہ یہ میزانیہ کسی ایسی قوم کا نہیں ہے جو خیر و شر کے واضح تصورات، خوب و ناخوب کے اپنے مخصوص پیمانے اور انسانوں کے باہمی روابط کا ایک خاص انداز رکھنے کی وجہ سے دوسری قوموں سے ممیّز اور ممتاز ہے۔ مرکزی اور صوبائی دونوں میزانیوں میں کوئی مدّ بھی ایسی نہیں جس سے اس بات کا معمولی اشارہ بھی ملتا ہو کہ یہ قوم کسی اخلاقی اور دینی نظام کی حامل ہے اور معاشی تگ و دو کا اپنا ایک مخصوص تصور رکھتی ہے۔

یہ میزانیے نظامِ سرمایہ داری کے پوری طرح عکاس ہیں اور اس بات کی کھلی غمازی کرتے ہیں کہ ایک قوم اسلام کے ضابطۂ حیات اور اس کی اخلاقی اقدار سے یکسر بے نیاز ہو کر اس طریق سے سرمایہ اندازی (CAPITAL FORMATION) کے لیے مختلف منصوبے بنا رہی ہے جس سے دولت صرف چند خاندانوں میں محدود ہو کر رہ جاتے اور بندۂ مزدور کے اوقات تلخ سے تلخ تر ہوتے چلے جائیں تاکہ اُس کے سارے اوقات، اُس کی ساری خداداد صلاحیتیں فکر

معاش کی نذر ہو جائیں۔

مرکزی وزیر خزانہ جناب محمد شعیب صاحب نے پاکستان کی معاشی ترقی کا بڑے طمطراق سے تذکرہ کیا ہے اور اعداد و شمار کی شعبدہ بازی سے حقیقتِ حال چھپانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ مارشل لا کے بعد حکومت نے مختلف ٹیکسوں کے ذریعہ اپنی آمدنی کو ۲۵۰ فیصد بڑھا لیا ہے مگر اس کے مقابلے میں مجموعی قومی پیداوار (GROSS NATIONAL PRODUCT) میں صرف تیس فیصد سے لے کر ۴۰ فیصد تک اضافہ ہوا ہے۔ چونکہ حکومت کی بیشتر آمدنی (تقریباً ۷۵ فیصد) کا دار و مدار بالواسطہ محصولات (INDIRECT TAXES) مثلاً کسٹم ڈیوٹی، مرکزی آبکاری ٹیکس اور محصول فروخت پر ہے اس لیے ۲۵۰ فیصد بڑھے ہوئے اخراجات کا زیادہ تر بوجھ طبقۂ امراء کے بجائے طبقۂ غرباء کو اٹھانا پڑتا ہے جو اپنی ناگزیر ضروریات حاصل کرنے کے لیے اپنی آمدنی کا بیشتر حصّہ ٹیکس کی صورت میں حکومت کے حوالے کر دینے پر مجبور ہوتا ہے۔ بیانات اور تقریروں میں قوم کو یہ مژدہ جانفزا سنایا جاتا ہے کہ پاکستان کو جلد از جلد ایک فلاحی مملکت میں تبدیل کیا جائے گا۔ لیکن اس فلاحی مملکت کا جو ابتدائی نقشہ اس بجٹ میں اُبھر کر ہمارے سامنے آتا ہے اُس میں تو عوام کوئی دلکشی محسوس نہیں کرتے۔ یہ ایک ایسی عجیب و غریب فلاحی مملکت تیار ہو رہی ہے جس میں غریب دن بدن غریب تر ہوتے جائیں گے اور دولت چند ہاتھوں میں سمٹتی چلی جائے گی۔ دولت کی عادلانہ تقسیم کے لیے یہ ضروری ہے کہ طبقۂ امرا اور طبقۂ غرباء کے درمیان جو غیر معمولی تفاوت پایا جاتا ہے اُسے حتی المقدور ختم کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ قوم کے سارے طبقات ایک بہتر اور شادکام زندگی بسر کر سکیں۔ لیکن اس "فلاحی مملکت" کا نظامِ محاصل طبقۂ امراء کے کندھوں سے بوجھ ہلکا کر کے اُن کمزوروں کی پشت پر لاد رہا ہے جن کی کمر پہلے ہی سے بوجھ تلے ٹوٹ رہی ہے۔ چنانچہ دیکھیے کہ بالواسطہ محصولات جن کی بیشتر زد طبقۂ غرباء پر پڑتی ہے ان میں کتنا غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔

گذشتہ دس سالوں میں مرکزی آبکاری محصول ۵۲۰ فیصد اور محصول فروخت ۳۶۰ فیصد بڑھا ہے۔ لیکن اس کے مقابلے میں انکم ٹیکس اور کارپوریشن ٹیکس جو براہ راست محصول ہونے کی وجہ سے طبقۂ امراء سے وصول کیے جاتے ہیں ان میں اضافہ کی شرح ۲۱۷ فیصد ہے پھر صنعت کاروں اور تاجروں کو مختلف حیلوں اور بہانوں سے اس ٹیکس میں مزید رعایت دی جاتی ہے اور انہیں دونوں ہاتھوں سے دولت لوٹنے کے بے شمار مواقع فراہم کیے جا رہے ہیں۔ اس افسوسناک صورت حال کا اس سال کے مرکزی میزانیہ سے بآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے وزیر خزانہ صاحب نے جن اشیاء کی شرح محصول میں اضافہ کا اعلان کیا ہے مثلاً سوتی کپڑا، سیمنٹ، پٹرول، تیل، سوڈا ایش، یہ وہ چیزیں ہیں جو انسانی بنیادی ضروریات میں شامل ہیں اور ایک غریب انسان اپنی آمدنی کا بیشتر حصہ پہلے ہی ان پر صرف کر رہا تھا۔ اب ٹیکس میں اضافے کی وجہ سے ان کی قیمتیں مزید بڑھ جائیں گی اور اس طرح غرباء پر عرصۂ حیات اور بھی تنگ ہو جائے گا۔

صوبائی میزانیہ بھی اسی سرمایہ دارانہ ذہنیت کی غمازی کرتا ہے اور اس میں بھی کوئی ایسی چیز نہیں ملتی جو اس بات کی شہادت دے سکے کہ اس ملک کے حکمرانوں کی نظر میں اسلام بھی کسی اہمیت کا حامل ہے اور اللہ کے دین کے بھی کچھ تقاضے ہیں جنہیں اصحاب اقتدار کو بحیثیت مسلمان اور بحیثیت حکمراں پورا کرنا چاہیے۔ جس دستور کی وفاداری کا حلف اٹھا کر وہ اقتدار کے تخت پر متمکن ہوتے ہیں اُس کی رُو سے یہ ان کی ذمہ داری ہے کہ اسلام کے اصولوں کو عملی جامہ پہنائیں اور مسلمانوں کو اس کے مطابق انفرادی و اجتماعی زندگی گزارنے کے قابل بنائیں۔ لیکن واقعات کی دنیا میں جو کچھ کیا جا رہا ہے وہ اس مقدس ارادے کے بالکل برعکس ہے۔

اسلام کے نزدیک سود جس نوعیت کی سنگین برائی ہے وہ کسی صاحب علم سے مخفی نہیں۔ اس بنا پر اربابِ بست و کشاد پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اس لعنت کو ملک سے جلد از جلد ختم کریں۔ دین و ایمان سے اُن کی وابستگی اور ملکی دستور سے اُن کی وفاداری

دونوں اس بات کی متقاضی ہیں کہ قوم کو اس بُرائی کے چنگل سے نجات دلائی جائے۔ لیکن دیکھیے یہاں عملاً کیا ہو رہا ہے۔ صوبائی وزیر خزانہ نے خود ایوان کے اندر اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ صوبائی حکومت پر قرضوں کا بوجھ برابر بڑھتا جا رہا ہے۔ چنانچہ اس وقت مغربی صوبے کے عوام بارہ ہزار کروڑ کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں۔ وزیر خزانہ صاحب نے مغربی پاکستان کی آبادی پانچ کروڑ بتائی ہے۔ اب اگر اس آبادی پر قرضوں کے بار کو تقسیم کیا جائے تو خطۂ پاک کے دائیں بازو میں ہر فرد چوبیس سو روپے (۲۴۰۰) کے قرض کا بار اٹھائے زندگی بسر کر رہا ہے۔ ایک اوسط خاندان جو پانچ افراد یعنی میاں، بیوی اور تین چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں پر مشتمل ہو وہ بارہ ہزار روپے کا مقروض ہے۔ اور یہ قرض بھی کوئی قرضِ حسنہ نہیں بلکہ ایسا قرض ہے جس پر اُسے سود کی ایک بھاری شرح عائد کرنی پڑتی ہے۔

شراب نوشی اسلام میں کتنا گھناؤنا فعل ہے، وہ کسی مسلمان سے تو کیا کسی غیر مسلم سے بھی پوشیدہ نہیں۔ باری تعالیٰ نے اسے عملِ شیطان سے تعبیر فرمایا ہے اور حضور سرورِ دو عالم نے اس گھناؤنے فعل کا ارتکاب کرنے والوں پر حد جاری کی ہے۔ اگر یہاں اللہ کے دین کا کچھ پاس ہوتا تو اس لعنت کی بیخ کنی کی جاتی۔ یہ بُرائی ابھی تک سوسائٹی کے نہایت اونچے، آزاد طبع اور مغرب زدہ طبقے تک محدود ہے یا انتہائی گھٹیا قسم کے اوباش اور بدمعاش لوگوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ عام مسلم معاشرہ ابھی اس کی زد سے محفوظ ہے۔ ان حالات میں اس کا قلع قمع کچھ مشکل نہیں لیکن حکومت اس کے خاتمہ کے لیے کوئی مؤثر قدم اٹھانے کے بجائے اندرونِ ملک میں اس کی تیاری کی اجازت اور بیرونِ ملک سے درآمد کے لائسنس دیتی ہے اور جو بدبخت اس کے رسیا ہیں انہیں اس سے روکنے کے بجائے اس کے استعمال کے لیے اجازت نامے جاری کرتی ہے تاکہ وہ اس حرام شے کو دھڑلے سے استعمال کر کے خود بھی برباد ہوں اور معاشرے کی بربادی کا سامان بھی پیدا کریں۔

ٹ بحوالہ "امروز" ۱۵ جون ۱۹۶۶ء

صوبائی وزیر خزانہ نے اسمبلی کے ارکان کے سامنے اس لعنت کے متعلق جو اعداد و شمار پیش کیے ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ گذشتہ اٹھارہ ماہ کے عرصہ میں صرف مغربی صوبے کے لیے ۳۲ لاکھ گیلن شراب درآمد کی گئی ہے اور ۹ لاکھ ۲ ہزار گیلن مغربی پاکستان میں تیار ہوئی ہے۔ ایک معزز رکن کے سوال کا جواب دیتے ہوئے وزیر خزانہ نے یہ بھی انکشاف فرمایا کہ یکم جولائی ۱۹۶۳ء سے ۳۱ مارچ ۱۹۶۶ء تک پونے چار سال کے عرصہ میں راولپنڈی، لاہور اور کراچی میں تیرہ لاکھ باون ہزار سات سو ایک گیلن شراب استعمال کی گئی اور سالِ رواں میں صرف لاہور کے دو ہزار آٹھ سو چھپن مسلمانوں کو شراب پینے کے پرمٹ جاری کیے گئے[1]

آپ خود ہی غور فرمائیں کہ کیا یہ طرزِ عمل کوئی ایسا طبقہ اختیار کر سکتا ہے جس کے دل میں اسلام، اُس کی روایات اور اُس کی تعلیمات کا کچھ بھی احترام ہو؟ شراب دینی، اخلاقی، طبی، معاشرتی اور معاشی نقطۂ نظر سے ایک بڑی بُرائی ہے۔ یہ ام الخبائث جب کسی قوم کے اندر راہ پاتی ہے تو اُسے برباد کر کے رکھ دیتی ہے۔ اس بُرائی کی روک تھام کرنے کے بجائے اسے اندرونِ ملک تیار کروا کر اور دوسرے ممالک سے درآمد کر کے اُن آبرو باختہ لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے جن کو اس کی چاٹ لگی ہوئی ہے۔ عیاش اور بد اخلاق لوگوں کے ساتھ تو اس فیاضی کا سلوک کیا جاتا ہے اور ان کی عیاشیوں کے لیے نہایت قیمتی زرِمبادلہ، جس کی ایک ایک پائی کی ہمیں اشد ضرورت ہے، صرف کرنے میں قطعاً تامّل نہیں کیا جاتا لیکن جب اسلام کے بنیادی فریضۂ حج کی ادائیگی کا سوال پیدا ہوتا ہے اور عوام اس کے لیے بیتابی کا اظہار کرتے ہیں تو اُن کے اس جائز دینی مطالبہ کو مسترد کرتے ہوئے یہ کہا جاتا ہے کہ زرِمبادلہ میں اتنی گنجائش نہیں کہ زیادہ افراد کو حج بیت اللہ کی اجازت دی جائے۔ چنانچہ اس غلط طرزِ فکر کا نتیجہ یہ ہے کہ بھارت سے جو ایک لادینی ریاست ہے اور جس نے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا ہے اور جہاں مسلمانوں کی آبادی پانچ چھ کروڑ

---

[1] نوائے وقت ۱۰ جون ۱۹۶۶ء

سے زیادہ نہیں، اس سال پاکستان کے مقابلے میں چار گنے زیادہ حاجی آئے۔

دونوں میزانیوں کی مدات خرچ پر بھی نگاہ ڈالیے اور اندازہ کیجیے کہ اس ملک کی کتنی دولت مفید اور کارآمد کاموں میں خرچ ہوتی ہے اور اس کا کتنا حصہ بیکار کاموں کی نذر ہو رہا ہے۔ لاکھوں روپے سالانہ کے صرف سے متعدد ایسے ادارے چلائے جا رہے ہیں جن کا مقصد بجز اس کے اور کوئی نہیں کہ وہ اسلام کے معاملے میں عوام کے اندر فکری انتشار پیدا کریں۔ آرٹ اور کلچر کی مختلف تنظیموں کو جن کی سرگرمیوں کے خلاف پورا ملک احتجاج کرتا ہے، عوامی احساسات کو پس پُشت ڈالتے ہوئے بڑی فیاضی کے ساتھ مالی امداد دی جاتی ہے۔ لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں کی رقم ایسے پروگراموں کی تکمیل کے لیے صرف کی جا رہی ہے جنہوں نے مغرب کے اخلاق کا جنازہ نکال دیا ہے اور جن کے خطرناک نتائج اس سُرعت کے ساتھ کھل کر ہمارے سامنے آ رہے ہیں کہ حسّاس اور فرض شناس لوگوں کی نیندیں حرام ہو گئی ہیں اور وہ دل گرفتہ ہو کر سوچ رہے ہیں کہ یا الٰہی یہ ملک کن عجیب اور خوفناک راہوں پر چل نکلا ہے۔ مگر حکومت ٹس سے مس نہیں ہوتی اور ان پر بے دریغ روپیہ صرف کرتی چلی جاتی ہے اور خزانہ پر قطعاً کوئی بار محسوس نہیں کرتی لیکن جب اُس سے کوئی شخص یہ دریافت کرتا ہے کہ حالیہ پاک بھارت جنگ کے دوران لاہور اور سیالکوٹ میں جن ۴۸ مساجد کو نقصان پہنچا ہے، کیا حکومت اُن کی مرمت کے بارے میں کسی طرح فکرمند ہے تو اُس کا ایک نمائندہ اسمبلی کے اندر صاف طور پر سرکاری پالیسی کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتا ہے:[لہ] مساجد نہ حکومت نے تعمیر کرائی ہیں اور نہ وہ ان کی مرمت کی ذمہ دار ہے۔ یہ کام مخیر حضرات اور سیاسی جماعتوں کو سرانجام دینا چاہیے۔ یہ مختصر سا ارشاد اسلام کے بارے میں حکومت کے طرزِ فکر اور طرزِ عمل کی پوری طرح غمازی کرتا ہے۔ حکومت مساجد کی تعمیر کے معاملے میں تو کوئی ذمہ داری قبول کرنے پر آمادہ نہیں مگر ضبطِ ولادت جو معاشی مسئلے سے کہیں زیادہ اخلاقی مسئلہ ہے اور جس کی زد مسلمانوں کے اعتقاد یعنی باری تعالیٰ کی صفتِ ربوبیت

لہ نوائے وقت ۲۳ر جون ۱۹۶۶ء

پر پڑتی ہے، اُسے پھیلانے اور ترقی دینے کے لیے حکومت بیتاب ہے اور اس پر زرِ کثیر خرچ کر رہی ہے۔ حالانکہ ہمارے ہاں جن ممالک کی تقلید میں یہ سب کچھ کیا جا رہا ہے اُن کی حکومتیں لادینی ہونے کے باوجود عوام کے مذہبی احساسات کا اس قدر احترام کرتی ہیں کہ ضبطِ ولادت کی اس تحریک کو فروغ دینے کے لیے کوئی مؤثر قدم اٹھانے سے وہ محض بعض عیسائی فرقوں، خصوصاً رومن کیتھولک فرقے کے جذبات کی پاسداری کی خاطر ہمیشہ گریز کرتی رہی ہیں اور انہوں نے اس مہم میں براہِ راست شریک ہونا کبھی پسند نہیں کیا۔

مساجد کی تعمیر میں یہ بے نیازی اور ضبطِ ولادت جیسی اخلاق سوز تحریک کے پھیلانے میں یہ سرگرمی کیا حکومت کے رجحانات کی عکاسی نہیں کرتی؟

اللہ تعالیٰ کو کسی نے دیکھا نہیں بلکہ اُس ذاتِ برحق کو اُس کی نشانیوں سے پہچانا ہے۔ ایمان چونکہ ایک قلبی کیفیت کا نام ہے اس لیے کسی شخص کی ایمانی حالت کا فیصلہ کسی محسوس معیار کو سامنے رکھ کر نہیں کیا جا سکتا۔ مگر یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ اللہ تعالیٰ سے قلبی لگاؤ، اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سچی محبت، اس کی تعلیمات سے وابستگی اور اُن کی اطاعت کا جذبۂ صادق، یہ سب ایمانی کیفیات انسان کے طرزِ فکر، اور اُس کے طرزِ عمل میں ضرور منعکس ہوتی ہیں اور یہ ناممکن ہے کہ کسی شخص کو اللہ کے دین سے گہری محبت بھی ہو اور وہ جان بوجھ کر ایک لگے بندھے منصوبے کے تحت ایسی تدابیر اختیار کرے جن سے دین کی تخریب کا خطرہ ہو، یا وہ اسلام دشمن قوتوں کا محاسبہ کرنے اور ان کا راستہ روکنے کے بجائے الٹے اُن کی تائید کرنے لگے۔

ہمارے ہاں اس وقت اسلام کے بارے میں حکومت نے جو رویہ اختیار کر رکھا ہے وہ کسی ایسی حکومت کو زیب نہیں دیتا جس نے اسلام کو اپنے دستور اور آئین کا بنیادی پتھر قرار دیا ہو۔ اربابِ اختیار کے اپنے بارے میں تو جذبات اس قدر نازک ہیں کہ جہاں کسی نے اُن کی کسی پالیسی یا طرزِ فکر سے اختلاف کیا وہیں جبینیں شکن آلود ہو گئیں اور تنقید کرنے والے کو اُن کی اس

بے جا جسارت کی سزا دینے کے لیے پوری سرکاری مشنیری حرکت میں آگئی۔ مگر اسلام کے خلاف یہاں جس کا جو جی چاہے کہتا رہے اُس سے کوئی مواخذہ نہیں کیا جاتا۔ اسلام کے بارے میں حکومت کی بے حسی کا حال یہ ہے کہ وہ اگر خود بھی کوئی قدم صحیح سمت میں اٹھاتی ہے تو اس پر اُس کا دل نہیں جمتا اور اپنے کیے ہوئے فیصلے کو نہ تو مؤثر طریق سے عملی جامہ پہناتی ہے اور نہ اس کے حق میں ٹھوس اور واضح دلائل دے کر مخالفین کو خاموش کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ یُوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ بعض اوقات عوامی دباؤ سے مجبور ہو کر کوئی ایسا اعلان جاری کر دیتی ہے جس پر لوگوں کو قدرے اطمینان ہوتا ہے اور وہ اسے ایک مفید قدم سمجھ کر اس کی پذیرائی کرنے لگتے ہیں۔ لیکن یہ اعلان یا تو اخبارات کی زینت بنتا ہے یا گشتی مراسلوں کی صورت میں دفتری فائلوں میں دب کر رہ جاتا ہے۔ عملی زندگی میں اس کے مطابق قطعاً کوئی تبدیلی نہیں کی جاتی۔ زندگی کی جوئے رواں جوں کی توں جاری رہتی ہے۔ تجدد پسند اور بے دین طبقے اس کے خلاف کھل کر بے سروپا باتیں کرتے ہیں مگر حکومت ٹس سے مس نہیں ہوتی اور وہ ان ساری باتوں کو اس خاموشی کے ساتھ برداشت کرتی ہے جیسے کہ وہ اس سارے ڈرامے کی خاموش تماشائی ہے اور اس کا خود اپنے اس فیصلے سے کوئی دُور کا تعلق بھی نہیں ہے۔ ابھی چند ہی روز کا واقعہ ہے کہ حکومت مغربی پاکستان نے تعلیمی اداروں میں ناچ گانے کی خرافات پر پابندی عائد کی اور ملک بھر میں حکومت کے اس اقدام کا خیر مقدم کیا گیا۔ اس اعلان کو سنتے ہی تجدد پسند اور ثقافت گزیدہ عناصر سخت برہم ہوئے اور انہوں نے اس کے خلاف اخبارات میں باقاعدہ ایک مہم شروع کر دی جس میں پیش پیش خود حکومت کے اپنے منظورِ نظر اخبارات ہیں۔ ان کے کالموں میں کبھی کسی بگڑے ہوئے مسلمان بادشاہ کو بطورِ مثال پیش کر کے رقص و سرود کی حمایت میں مضامین لکھے گئے اور کبھی یہ بھونڈی دلیل دی جانے لگی کہ اگر مغربی پاکستان کے سکولوں اور کالجوں میں ناچ گانے کا پرچم سرنگوں ہو گیا تو مشرقی پاکستان سے قومی وحدت کے رشتے کمزور ہو جائیں گے۔ گویا مغربی اور مشرقی پاکستان اور میں اگر کوئی قدر مشترک ہے تو وہ ناچ گانے کا جنون ہے۔

اس کے سوا ان میں اخوت کا کوئی دوسرا رشتہ موجود نہیں۔ سوال یہ ہے کہ جب حکومت نے اس معاملے میں ایک مستحسن قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا اور اس کے فیصلے کو پوری قوم کی تائید بھی حاصل ہے تو کیا اس کا یہ فرض نہ تھا کہ وہ اسے جلد از جلد نافذ کرنے کی کوشش کرتی اور نشرو اشاعت کے سارے ذرائع استعمال کر کے گنتی کے اُن چند لوگوں کا مسکت جواب دیتی جو اس معاملے میں انتشار پیدا کر رہے ہیں۔ لیکن یہاں حال یہ ہے کہ نیشنل پریس ٹرسٹ کے اخبارات میں جن پر حکومت کا براہِ راست قبضہ ہے اس فیصلے کے خلاف بڑے دل آزار خطوط اور مضامین شائع ہو رہے ہیں اور ان سے کوئی باز پُرس نہیں کی جاتی، حالانکہ حکومت کی مرضی کے خلاف ایک لفظ لکھنے کی بھی وہ جرأت نہیں کر سکتے۔ اگر یہ اخبارات غیر متوازن اور غیر حقیقت پسندانہ میزانیوں کے حق میں حکومت کے ایما پر لمبے لمبے اداریے لکھ سکتے ہیں تو ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ آخر اس صحیح فیصلے کے حق میں لکھنے کے لیے ان اخبارات کے صفحات میں کیوں گنجائش نہیں نکلتی اور اس کے خلاف طعن و تشنیع سے بھرا ہوا مواد وہ کیسے شائع کرتے ہیں۔ ممکن ہے بعض لوگ اسے حکومت کی رواداری اور وسیع المشربی سمجھیں۔ لیکن یہ بات کسی طرح بھی صحیح نہیں۔ اگر حکومت یہ سب کچھ اپنی وسیع الظرفی کی وجہ سے گوارا کر رہی ہے تو پھر اُسے اپنے سیاسی حریفوں اور اپنے طرزِ عمل سے اختلاف کرنے کے ساتھ بھی اِسی فیاضی اور بُردباری کا ثبوت دینا چاہیے۔ اسلام کے معاملے میں تو وہ اتنی روادار ہے، مگر خود اپنے معاملہ میں اس کا حال یہ ہے کہ کوئی معمولی سی تنقید بھی برداشت نہیں کر سکتی اور اُن لوگوں کی آزادی سلب کرنے کی کوشش کرتی ہے جو اس کے کسی قول یا فعل پر گرفت کرنے کی جسارت کرتے ہیں۔

اس ملک کے عوام اور اس کے اربابِ اختیار کو یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ باری تعالیٰ بڑا غیرت مند ہے۔ وہ اپنے دین کو دنیا پرستوں کے ہاتھ میں کبھی کھلونا بنانا گوارا نہیں کرتا۔ قرآن حکیم، سنتِ نبوی اور تاریخ اس حقیقت پر گواہ ہیں کہ اس نے

کمزور سے کمزور انسانوں کو جو ہر طرح کے مالی وسائل سے محروم تھے، خدمتِ دین کا اعزاز بخشا لیکن اُس علیم و خبیر اور غیور ذات نے کبھی دین کے نام پر کھوٹے سکوں کو چلنے نہیں دیا۔ اُس ذات بے ہمتا نے کمزوری بے کسی، وسائل سے محرومی، غرض مال و متاع کی ہر کمی کو اپنی رحمتِ خاص سے پورا کر کے اُن لوگوں کے ہاتھوں دین کی سر بلندی کا سامان کیا جو دنیا میں حقیر سمجھے جاتے تھے اور پھر دنیا اور آخرت دونوں میں انہیں سرفراز فرمایا۔ لیکن اُس نے اُن لوگوں کو کبھی پنپنے کا موقع نہیں دیا جنہوں نے دین کے نام پر دنیا کی تجارت کی اور اسے محض ترقی اور اقتدار کے حصول کے لیے بطور ذریعہ استعمال کرنے کی ناپاک جسارت کی۔

اخبارین حضرات اور اُن کی وساطت سے یہ بات غالباً پاکستان کے ہر فرد تک پہنچ چکی ہو گی کہ امیر جماعت اسلامی پاکستان، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے صوبائی وزیر اوقاف جناب حبیب اللہ خاں کے بیان کا جواب دیتے ہوئے یہ فرمایا ہے کہ ہم جنگ سے تباہ شدہ مساجد کی تعمیر اور مرمت کو اپنے لیے بہت بڑی سعادت سمجھتے ہوئے اس کی ذمہ داری قبول کرتے ہیں اور باری تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اُس بزرگ و برتر ذات نے ہمیں اس کا موقع عطا فرمایا ہے۔ حکمران طبقہ اس فرض سے بےشک غافل ہو لیکن مسلمان قوم اس سے کبھی غافل نہیں ہو سکتی۔ اُس کی نظر میں دارالخلافہ، مختلف ہوٹلوں اور نمائشی منصوبوں کی تعمیر ایک مسجد کی تعمیر کے مقابلے میں پرکاہ کی حیثیت بھی نہیں رکھتی۔ وزیر صاحب کا یہ جواب پوری مسلم قوم کے دینی احساس کو چیلنج ہے۔ ہم بجا طور پر اس بات کی توقع رکھتے ہیں کہ پاکستانی عوام اس کارِ خیر میں جماعت اسلامی کے ساتھ پوری گرم جوشی اور جذبہ اخلاص کے ساتھ تعاون کریں گے۔

مسجد ایک عمارت نہیں بلکہ اللہ کا گھر، ایک مسلمان کے مذہبی احساس کا مظہر اور اُس کی تعلیم و تربیت کا سب سے بڑا ادارہ ہے۔ اُس کی تعمیر درحقیقت اُس کے دینی احساسات کی تعمیر ہے اور اس معاملے میں غفلت درحقیقت دین سے غفلت کی کھلی شہادت ہے۔